Urdu Research Journal :Refereed Journal for Urdu
ISSN 2348-3687 Issue: 9th,Sept-Dec. 2016

ترجمہ: ایک تہذیبی ولسانی مفاہمہ

ڈاکٹر ابو شہیم خان
شعبہء اردو وفارسی، ڈاکٹر ہری سنگھ گور سنٹرل یونیورسٹی ساگر 470003 مدھیہ پردیش
shaheemjnu@gmail.com Mob;07354966719

Tarjama: Ek Tahzeebi Wa Lisani Mufahima by Dr. Abu Shaheem Khan, P. No. 17 to 22

تمام علمی و ادبی کارناموں کی طرح ترجمے کا بھی راست تعلق ترسیل اور ابلاغ سے ہے ۔ ترسیل اور ابلاغ کو موثر، بلیغ اور مفرح بنانا اور بنائے رکھنا ہمیشہ ایک چیلنج رہا ہے خاص طور پر تخلیق کاروں کے لیے۔ اس چیلنج سے نبرد آزمائی میں ترجمے کی ایک تاریخی اہمیت ہے کیوں کہ ترجمہ تجربے کی تشکیل نو اور ترسیل کے ساتھ تخئیل کو بھی بال و پر عطا کرنے میں معاون ہوتا ہے۔ اسی لیے جملہ امور عالم میں جو سرگرمیاں سب سے زیادہ اہمیت وقدر و قیمت رکھتی ہیں ان میں ترجمہ کو بھی شامل حال سمجھا جاتا ہے۔ یہ ایک مستقل فن ہے جس میں دسترس کے لیے شوق وصلابت، مشق ومزاولت درکار ہے۔ یہ فن مشرق ومغرب کی بعض یونیورسٹیوں میں ایک علاحدہ مضمون کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ دوسرے سماجی علوم کی طرح ''مطالعات ترجمہ یا ترجمیات'' کا بھی سائنس یا آرٹ ہونا اور نہ ہونا زیر بحث ہے۔ اس کی روزافزوں ترقی اہمیت وافادیت کے پیشِ نظر مختلف عالموں نے ترجمہ کو مختلف ناموں سے موسوم کیا ہے۔ کسی نے اس کو نگینہ جڑنے کا فن تو کسی نے لسانی وتہذیبی مفاہمہ کا نام دیا ہے۔ اسی طرح کچھ نے بین الاقوامی اندازِ نظر پیدا کرنے کا وسیلہ اور تہذیبی معاملوں کے اتحاد کا نام دیا ہے، تو بعض نے ترجمہ کو تصورات کی تہذیبی باز آبادکاری (Cultural Rehabilitiation) کا فریضہ ادا کرنے والا بھی کہا ہے۔ غرضیکہ مختلف دانشوروں نے اس کو مختلف اغراض و مقاصد کے پیش نظر یا پس منظر میں اس کی تعریف وتوضیح کی ہے۔ عظیم مؤرخ Daniel Borestin نے ترجمہ کی اہمیت یوں بیان کی تھی کہ :

> "Translation is a great device of exploration."

پروفیسر محمد حسن نے ترجمے کے بارے میں لکھا تھا کہ :

> ''بنیادی طور پر ترجمہ لسانی وتہذیبی مفاہمہ ہے جو نہ اصل کی لذت کو پوری طرح پاسکتا ہے نہ اس سے مکمل طور پر محرومی کو قبول کرتا ہے۔

یعنی ترجمہ ایک زبان کے مافی الضمیر کو دوسری زبان میں پیش کرنے کا نام ہے جس کے ذریعے تمدنی افہام وتفہیم کے مرحلے طے کیے جاتے ہیں اور تصنیف وتالیف کے تشکیلی منزلوں کی معلومات بہم پہنچائی جاتی ہے۔''

دنیا کے مختلف حصوں کی تہذیبی، سیاسی، معاشی اور سماجی تاریخ و روایات کئی معنوں میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ایک دوسرے کو جاننے سمجھنے اور رابطہ قائم کرنے کا عمل مختلف ذریعوں، سطحوں اور سمتوں میں قدیم زمانے سے ہوتا رہا ہے۔ وقت اور ذرائع کی بنیاد پر یہ عمل کبھی تیز اور کبھی سست ہوتا ہے۔ انسانی ارتقا کی تاریخ میں زبان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے جو افراد کے درمیان رابطہ قائم کرنے کا مؤثر ترین ذریعہ ہے جو اگلے وقتوں کے لیے علم کو محفوظ رکھنے کا کام بھی انجام دیتی ہے۔ دوسرے کی بات سمجھنے اور اپنی بات سمجھانے کے لیے کسی مشترک زبان کا ہونا ضروری ہے۔ اس لیے تراجم کا عمل انسانی تہذیب وتمدن، مزاج اور تاریخ کی دریافت وشناخت کا اہم ذریعہ بن جاتا ہے۔ ترجمہ زبان کو علمی اور ادبی سطحوں پر ایک وسیع تناظر بھی مہیا کرتا ہے جس کے ذریعہ زبانیں تجربہ اور اعتماد حاصل کرتی ہیں۔ جن تہذیبوں میں دوسری تہذیبوں سے رابطہ قائم کرنے کا یہ عمل رک جاتا ہے ان کی ترقی کی راہیں محدود یا مسدود ہوجاتی ہیں، ترجمہ کی مدد سے ہی انسانی تاریخ میں فلسفہ، حکمت وتہذیب کے ارتقا کی کھوئی ہوئی کڑیاں بھی مل جاتی ہیں۔ ترجمے کی اسی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ظ۔ انصاری لکھتے ہیں :

> ''سقراط اور افلاطون کی دو ہزار سال سے زیادہ پرانی کاوشیں، روما اور یونان کے قدیم کھنڈروں میں دب کر رہ گئی تھیں اگر عربی زبان کے ذی علم مترجم انھیں وہاں سے نکال کر یورپ اور ایشیا کی آخری سرحدوں تک کھلی ہوا میں نہ لے گئے ہوتے، بوعلی سینا، ابن رشد، ابونصر فارابی کے کارنامے، یروشلم، غرناطہ اور بغداد کے محاصرے میں دم توڑ چکے ہوتے اگر بعد کی لاطینی زبانوں نے انھیں اپنے یہاں منتقل کر کے تاریخ وفلسفے کے اگلے وقتوں کے لیے محفوظ نہ کر لیا ہوتا۔''

ادب مشرق کا ہو یا مغرب کا یہ انسانیت کا ایک مشترک سرمایہ ہوتا ہے اور اس سرمایہ پر پورے عالم انسانی کا حق ہے۔ اور ترجمہ ہی وہ واحد ذریعہ اور وسیلہ ہے جس کے ذریعہ عالم انسانی اپنے اس حق کا استعمال کرسکتی

ہے اور عالم گیر آ گہی کے نور و سرور سے مستفیض ہوسکتی ہے۔ بقول پروفیسر محمد حسن صاحب :

''عالم گیر آ گہی کا نور اور سرور ایک زبان کے دامن میں تو سمٹنے سے رہا۔ جب تک ایک زبان کے بولنے والے دوسری زبانوں کے علم و آ گہی، جذبے اور شعور، فکر و احساس ٹکنیک اور سائنس تک پہنچنا چاہیں گے ترجمے کا سہارا لیں گے۔ خواہ یہ سہارا کیسا ہی ناتمام اور ناقص کیوں نہ ہو۔''

پچھلی کئی دہائیوں میں ذرائع ترسیل وابلاغ کے فروغ یا برقیاتی انقلاب ومہاجرت نے مختلف تہذیبوں کے اختلاط کا عمل تیز تر کر دیا ہے۔ مسافرت، ٹیلی ویژن، فیکس، ٹیلی فون، انٹرنیٹ اور کنورجنس (Convergence) اور اس کے علاوہ انفارمیشن ٹکنالوجی کے دیگر وسائل کے ذریعہ مختلف تہذیبوں کے بیچ کی دوریوں میں کمی اور تہذیبی تصادم کے نظریہ کو ضرب پہنچی ہے۔ عالمی گاؤں یا گلوبل ویلیج (Global Village) کا تصور ایک حقیقت بن رہا ہے۔ ایک دوسرے کو اور بہتر طریقے سے جاننے اور سمجھنے کا عمل تیز تر ہوا ہے اور اس میں اپنی پہچان وشناخت قائم کرنے کی خواہش وضرورت بھی۔ بروقت اکثر لوگ کئی زبانیں بولتے اور سمجھتے ہیں۔ دنیائے ادب میں جس عالمی ادب کا تصور بہت زمانے تک مبہم تھا اب اس کے امکان، اہمیت اور ضرورت کے نقوش زیادہ روشن ہو گئے ہیں۔ ظاہر ہے اس سلسلے کی درمیانی کڑی ترجمہ ہے۔ تقابلی ادبیات کے فرانسیسی نژاد امریکی پروفیسر ایلبرٹ گیرارڈ نے اپنی مایہ ناز تصنیف World Literature کے مقدمہ میں لکھا تھا کہ ''عالمی ادب کے تصور کو ایک ٹھوس حقیقت میں تبدیل کرنے کے لیے ترجمہ ایک ناگزیر وسیلہ ہے۔''

یعنی ترجمہ وہ ذریعہ ہے جس سے دوسری قوموں کے احوال ہم پر کھلتے ہیں اور یہ عہد جدید کی ایک ایسی ضرورت ہے جس کے بغیر ہم عالمی سطح کی علمی وادبی سرگرمیوں میں شریک نہیں ہو سکتے۔ اس کے لیے ہندوستان سمیت دنیا بھر میں کئی ادارے کام کر رہے ہیں جس کے نتیجے میں کوئی بھی اہم تخلیق خواہ وہ کسی زبان میں ہو کچھ دنوں میں دنیا کی بیشتر زبانوں میں دستیاب ہو جاتی ہے جس سے وہ تخلیق کسی ایک زبان یا ملک تک محدود ہو کر نہیں رہ جاتی بلکہ عالمی ادب کا حصہ بن جاتی ہے۔

ترجمہ ادبی تنقید کی ایک شاخ یعنی تقابلی مطالعہ کو ایک نئی جہت عطا کرتا ہے۔ اس تقابلی مطالعے کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں کہ ایک دور میں مختلف تہذیبوں کا طرز فکر اور احساس و جمالیاتی قدریں ایک دوسرے سے کتنی مماثلت یا اختلاف رکھتی ہیں۔ کسی تہذیب میں رونما ہونے والے واقعات کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کا انداز بیان کیا ہے؟ اور پھر مختلف ادوار میں فکری و جمالیاتی تحریکات جو ادب کو متاثر کرتی ہیں ان کا دائرہ محض کسی زبان و ادب تک محدود نہیں رہتا بلکہ ان سرحدوں کو پار کر کے دوسری زبانوں اور ان کی ادبیات تک پہنچتا ہے۔ اس سے نئے موضوعات، اسالیب وطرز فکر کی نشو ونما بھی ہوتی ہے۔ کچھ سطحوں پر وہ مشترک بھی ہوتی ہیں اور مختلف بھی۔ اور ان دونوں کے مطالعے سے ادب کا نہیں اس ادب کے دائرہ اثر میں آنے والے معاشرے اور اس کی حسیت کے بارے میں اہم نتائج نکالے جاسکتے ہیں مثلاً اردو ادب میں ترقی پسند تحریک جس نے براہ راست روس کی اشتراکی تحریک سے حرارت حاصل کی۔ لیکن ہندوستانی حالات و معاشرے کی پیچیدگیوں کے سبب یہ کئی معنوں میں اس سے مماثل تھی اور کئی سطحوں پر مختلف بھی۔ اسی طرح فٹز جیرالڈ کے خیام کی رباعی کے ترجمے سے فارسی ادب کا مغرب پر کیا رد عمل ہوا یا مغرب نے خیام کی توضیح کس طرح کی وہ فارسی نقادوں سے خاصی مختلف بھی ہوسکتی ہے۔ یعنی ترجمہ ایک طرف تو انسانی علوم میں اضافے اور ذہنی سرحدوں کو کشادہ کرنے کا ذریعہ بنتا ہے تو دوسری طرف اس کے ذریعے نئے نئے خیالات زبان میں داخل ہوتے ہیں اور زبان کی قوت اظہار میں نئے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس کے ذریعہ ایک بین الاقوامی انداز نظر پیدا ہوتا ہے کیوں کہ یہ ترجمہ بذات خود بین الاقوامی نقطۂ نظر کی پیداوار ہے۔

عالمی ادب کے اس دائرہ عمل میں برصغیر کے اہم کلاسیکی ادیبوں اور خاص کر اردو ادیبوں کی نمائندگی بہت محدود ہے۔ اس کی اہم وجہ اس عظیم ورثے کا دوسری زبانوں میں معیاری ترجمہ دستیاب نہ ہونا ہے جس کی وجہ سے وہ آج بھی دنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہے۔ گرچہ چند مشہور اردو ادیبوں کے تراجم دوسری ملکی وغیر ملکی زبانوں میں ہوئے ہیں اور کچھ ادیبوں کے تراجم کیے بھی جا رہے ہیں لیکن سوائے چند تراجم کے ابھی کچھ خاطر خواہ نتائج سامنے نہیں آئے ہیں۔ چند ہی اردو ادیب ایسے ہیں جن کے ایک یا ایک سے کچھ زیادہ تراجم موجود ہیں۔ نتیجتاً بین الاقوامی کلچر وتہذیب پر اس ادب کے اثرات مرتب ہوتے نظر نہیں آتے ہیں۔ اور عالمی ادب میں ہمارا حصہ بالکل نہیں کے برابر ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ زبانوں کی مقبولیت پھیلاؤ اور اہمیت کا دارو مدار بڑی حد تک ان کے مفید ہونے اور علمی وادبی سرمائے کو زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچانے کی اہلیت پر ہے۔ بقول پروفیسر محمد حسن :

''اس میں کوئی شک نہیں کہ آج جب دنیا کی طنابیں کھنچ رہی ہیں اور عالم گیر سطح پر ایک اکائی بنتا جا رہا ہے کوئی بھی زبان ترجمہ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ جب تک نئے خیالات کا خون اور نئی آ گہی کا نور رگ و پے میں سرایت نہ کرے زندگی دشوار ہے۔ یہی نہیں

بلکہ آج کی دنیا میں زبانوں کی مقبولیت پھیلاؤ اور
اہمیت کا دارومدار بڑی حد تک ان کے مفید ہونے پر
ہے۔ اور افادیت کا پیمانہ یہ ہے کہ کوئی زبان اپنے
زمانے کے علمی سرمایے اور ادبی ذخیرے کو کس حد
تک اپنے پڑھنے والوں تک پہنچانے کی اہل ہے۔
اردو زبان کی خوش بختی ہے کہ اس نے ترجمے کی
روایت کو ابتدا ہی سے اپنایا اور اپنے دریچے باہر سے
آنے والی ہواؤں کے لیے کھولے اور بین الاقوامی
کلچر کے نقوش سے اپنی محفل کو آباد کیا۔ اس دور تک
آتے آتے وہ پرانی روایت بھی ناکافی ہوئی اور نئی
دنیا کے تہذیبی سیاق وسباق نے برق رفتاری کے
ساتھ ترجمے کے کام کو پھیلانے کو ناگزیر بنا دیا۔"

Global Village اور 'عالمی ادب' کے تصور کو Explosion of Knowledge نے مہمیز لگائی ہے اور اس روز افزوں علمی سیلاب کے باعث 'عالمی ادب' اور Global Village کے تصور کو ٹھوس حقیقت میں صرف اور صرف ترجمہ کے ذریعہ ہی بدلا جا سکتا ہے Translate or Perish پر مناسب ردعمل کا اظہار نہ ہوا تو اردو یا کوئی اور زبان دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے شانہ بہ شانہ نہیں چل سکے گی۔ اور عالمی ادب میں ہماری حصہ داری یا شناخت ناقابل اعتنا ہوگی کیوں کہ نئی زبانیں قدیم زبانوں کی انگلی تھام کر ہی چلنا سیکھتی ہیں اور قدیم وجدید زبانیں اپنی ہم عصر زیادہ دولت مند زبانوں کا سہارا لیتی ہیں اور یہ عمل تاریخ وتمدن کے ایک باب کی طرح ہمیشہ سے جاری ہے۔ اور ترجمہ ہمارا سب سے اہم ذریعہ ہے جس کی بدولت یہ عمل آج تک جاری ہے۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے اور کڑی سے کڑی ملتی جاتی ہے۔ یہ عمل تمام جدید زبانوں کی طرح اردو کے ساتھ بھی کچھ خاص خصوصیات کا حامل ہے۔ کیوں کہ کسی زبان کی ترویج و اشاعت کے ساتھ ساتھ اس کو ادبی درجہ عطا کرنے اور ترقی پذیر زبانوں کی صف میں داخل کرنے میں ترجمہ کا بہت ہی اہم رول ہوتا ہے اور ترجمہ ہی کی بدولت وہ ایک باقاعدہ زبان بنتی ہے۔ اگر ہم اردو زبان اور اس کی ترقی کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ بات بالکل ہی عیاں اور ثابت ہو جاتی ہے کہ ترجموں کی بدولت ہی اردو ایک باقاعدہ زبان بنی۔ بقول ڈاکٹر ظ۔ انصاری :

"اردو تو ایک باقاعدہ زبان بنی ہی ترجموں کی
بدولت۔ ورنہ جب تک وہ کھڑی بولی کے روپ میں
تھی اسے کسی بڑے قلم کار نے ادبی تصنیف کے قابل
نہ سمجھا۔ بولی سے زبان تک کا طویل فاصلہ ایک
صدی کے اندر طے کر لینے میں ترجموں کا بڑا ہاتھ
ہے۔ کہیں یہ ترجمے کتابی صورت میں ہوئے اور کہیں
محض خیال، استعارے، اور اصطلاحوں کی صورت
میں...... بہر حال یہ مسلم ہے کہ عربی، فارسی، سنسکرت
اور انگریزی کے علاوہ بھاشاؤں کے ترجمے اور
ترجمان کو اردو زبان کی تعمیر اور تربیت میں بڑا دخل
ہے۔" ۱؎

مترجم کو چبائے ہوئے لقمے کو چبانے والا یا Traitor اور Immitator کہا جائے یا Maker، اس کی اہمیت وافادیت طلوع تہذیب سے اپنی جگہ مسلم ہے کیوں کہ ترجمہ نے انسانوں اور قوموں کے درمیان حائل بہت سی دیواروں کو توڑا ہے اور ہر عہد میں نئے نئے افکار و نظریات کو ایک قوم سے دوسری قوم تک پہنچانے میں، ایک تہذیب کو دوسری تہذیب سے روشناس کرانے میں ترجمہ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اقوام کے درمیان لین دین، افہام وتفہیم محض معاشی اور سیاسی سطح پر نہیں ہوتی فکری اور تہذیبی سطح پر بھی ہوتی ہے اور ترجمہ کے ذریعہ ایک زبان دوسری زبان سے متعارف ہوتی ہے اور اس کے طریقۂ اظہار، نحوی ساخت، اور مزاج سے استفادہ کرکے وسعت حاصل کرتی ہے۔ بقول پروفیسر قمر رئیس :

"ترجمہ نے ہر عہد میں نئے نئے افکار ونظریات کو
ایک قوم سے دوسری قوم تک پہنچایا ہے۔ ایک
تہذیب کو دوسری تہذیب سے روشناس کرایا ہے۔
ترجمہ کے ذریعہ ہی ایک زبان دوسری زبان کے
اظہارات اس کے مزاج اور نحوی ساخت سے
متعارف ہو کر اپنا روپ رنگ بدلتی اور وسعت حاصل
کرتی ہے۔ اکثر دوسری زبانوں کے شاہکاروں کا
ترجمہ بھی ادیبوں کو نئے ادبی میلانوں اور فنی
معیاروں کا احساس دلا کر نئے تجربات پر اکساتا اور
نئے ادبی رجحانات کا محرک ثابت ہوتا ہے۔"

ترجمہ ایک مشکل اور کبھی کبھی ناممکن عمل ہے۔ اس کے باوجود بنیادی ضرورتوں کے پیش نظر اس امر مشکل کو کرنا ہی پڑتا ہے جس میں بے انتہا دشواریاں اور پریشانیاں درپیش ہوتی ہیں۔ مترجم کو خاردار جھاڑیوں سے اپنا دامن بچا کر منزل مقصود تک پہنچنا ہوتا ہے۔ ادبی تراجم کے سفر میں بہت ساری پریشانیاں اور کلفتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ نثری ادب کے مقابلے شعری ادب کے تراجم میں پریشانیاں اور بڑھ جاتی ہیں۔ علوم کے ترجمے میں صرف مواد کو منتقل کرنا ہوتا ہے اسلوب کو نہیں۔ جب کہ ادبی تراجم میں ایک تہذیبی سانچے کو دوسرے تہذیبی سانچے میں، ایک شعری ونثری روایت کو دوسری نثری وشعری روایت میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔ جملوں کی ساخت، آہنگ اور اسلوب کی نیت کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے اور اسے بھی مطلوبہ زبان میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔ اصل زبانوں کے لفظوں کے جادو کو مطلوبہ زبان کی لفظیات میں جگانا ہوتا ہے جو کہ آسان امر نہیں ہے کیوں کہ زبانوں کی

Urdu Research Journal :Refereed Journal for Urdu
ISSN 2348-3687 Issue: 9th,Sept-Dec. 2016

نفسیات، صوتیات، نحوی ترکیب، لغات، لہجے اور محاورے ایک دوسرے سے کافی مختلف ہوتے ہیں اور ان میں ترجمہ بہت مشکل ہوتا ہے۔ مترجم کو کافی chanllenges کا سامنا ہوتا ہے اور بیک وقت بہت سارے لوازمات کو ملحوظ خاطر رکھنا ہوتا ہے۔ نثری ادب کیمقابلے شعری ادب کے تراجم میں یہ پریشانیاں دوبالا ہوجاتی ہیں خصوصاً غزل کے ترجمے میں۔ نظم چونکہ کسی ایک خاص موضوع پر محیط ہوتی ہے اور نسبتاً طویل ہوتی ہے، شعری پابندیاں غزل کے مقابلے کم ہوتی ہیں یعنی مترجم کو اس کے سمجھنے اور ترجمہ کرنے میں نسبتاً آزادی اور آسانی ہوتی ہے۔ لیکن یہ آسانی غزل کے ترجمے میں نہیں ہوتی اور بہت ساری پریشانیوں اور challenges کا سامنا ہوتا ہے۔ تجربہ کار، کہنہ مشق اور تخلیقی ذہن رکھنے والا مترجم ہی ان مسائل ومشکلات اور پریشانیوں سے ابر سکتا ہے۔ ترجمہ کی پریشانیاں، مسائل ومشکلات اس وقت مشکل تر ہوجاتی ہیں جب دونوں زبانوں کی صوتیات، ترکیب نحوی، لغات، لہجے اور محاورے اور دونوں زبانوں کی تہذیب اور ان کا مزاج مختلف ہو اور ترجمہ ادب خصوصاً شعری ادب کا ہو۔ ایک اچھا مترجم زبان کی معنوی خصوصیات کو ملحوظ رکھتا ہے کیوں کہ دو زبانوں میں بامعنی اظہار کے لیے ایک ہی طرح کی علامت نہیں ہوتی ہے جس سے ترجمہ میں معلومات کی مکمل ومن وعن ترسیل کا زیاں ہوتا ہے۔ Nida نے لکھا تھا کہ Distoration take place due to ethno linguistic design of communication یعنی نسلی، لسانی نظامِ ترسیل میں تفاوت کے باعث دورانِ ترجمہ متبادل لانے میں پریشانیاں اور مسائل درپیش ہوتے ہیں۔ اردو شاعری کا انگریزی میں ترجمہ کرنے میں ان دقتوں، مسائل و مشکلات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مشہور مصنف، شاعر، ناول نویس و افسانہ نگار، ناقد و مترجم شیو۔ کے کمار نے اپنی کتاب Best of Faiz کے مقدمے میں لکھا ہے کہ :

> "Translating Urdu poetry into English verse is a formidable task, especially when one undertakes to translate as difficult a poet as Faiz Ahmad Faiz whose innovated thought process often make his syntax very complex, almost intractable to rendition in a Inaguage whose diction, phrasing and rhythmic patterns are not tuned to oriental sensibility."

یعنی اردو شاعری کو انگریزی شعری قالب میں ڈھالنا ایک مشکل فعل ہے۔ خصوصاً فیض احمد فیض کی طرح کسی مشکل شاعر کے کلام کا ترجمہ۔ جس کے پر پیچ خیال وفکر کا عمل ان کے تراکیب اور جملوں کی ساخت کو پیچیدہ بنا دیا ہو اور جس کی ادائیگی کسی ایسی زبان میں جس کے لغات، محاورے اور آہنگ کی ترتیب وتنظیم مشرقی حسیت سے مطابقت نہ رکھتی ہو عموماً اس میں ترجمہ مشکل ہوتا ہے۔ اسی مقدمے میں آگے چل کر شیو کے۔ کمار نے فیض احمد فیض کا جو کہ خود ایک اچھے مترجم تھے اور انگریزی و اردو زبانوں پر یکساں دسترس حاصل تھی کا ترجمہ کے مسائل ومشکلات پر نظریہ نقل کیا ہے۔ فیض کے مطابق :

> "Translating poetry, even when confined to a cognate language with formal and idiomatic affinities with the original composition, is an exacting task, but this task is obviously for more formidable when the languages involved are as far removed from each other in cultural background, rhythmic and formal patterns, and the vocabulary of symbol allusion as Urdu and English."

یعنی شاعری کا ترجمہ چاہے ایک لسانی خاندان کی زبان (cognate) میں ہو جو اصل تخلیق کے ساتھ اصولی اور محاوراتی قربت رکھتی ہو ایک دقت طلب عمل ہے اور یہ عمل مزید مشکل ہوجاتا ہے جب اصل و مطلوبہ دونوں زبانیں تہذیبی پس منظر، آہنگ، صرفی ونحوی اصول، اشارہ و علامت کی لفظیات، تشبیہات واستعارات میں اردو انگریزی کی طرح ایک دوسرے سے بالکل ہی مختلف اور بعض صورتوں میں متضاد ہوں۔

یعنی ترجمہ کا عمل فی نفسہٖ بہت مشکل ہے۔ ترجمہ جب سائنس کا ہو، تاریخ کا یا اور دوسرے علوم وفنون کا ہو تو کسی قدر آسان ہوجاتا ہے لیکن شاعری کا ترجمہ بہت ہی مشکل ہوتا ہے کیوں کہ شاعری میں الفاظ، صرف معلومات یا محض تصورات پیش نہیں کرتے بلکہ ایک خاص فضا اور کیفیت کے مالک ہوتے ہیں۔ اس خاص فضا اور کیفیت کو معلومات اور تصورات کے ساتھ دوسری زبان اور دوسری تہذیب کے سیاق وسباق میں بٹھانا مشکل ہوتا ہے۔ اسی لیے معلوماتی ترجمہ کے برعکس شاعری کا ترجمہ سب سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ خصوصاً کسی ایسی زبان میں جس کا اصل زبان سے یا متن سے کوئی لسانی رشتہ نہ ہو اور دونوں زبانوں میں اختلاف ہو اور الگ الگ ماحول میں

پروان چڑھی ہوں اور دونوں زبانوں میں فن شاعری کے اصول جدا جدا ہوں اور دونوں کی شعریات بالکل مختلف ہوں۔ اس لیے شاعری کا ترجمہ شاعری ہی میں کرنا بہت ہی مشکل اور جوکھم کا کام ہے۔ ان ہی مشکلات کے باعث ترجمہ کے بارے میں مختلف دانشوروں کے مختلف ومتضاد اقوال ہیں جیسے والٹیر (Voltaire) کا کہنا ہے کہ :

''تراجم کسی تخلیق کی کمی میں اضافہ کرتے ہیں اور اس کے حسن کو تہ و بالا کرتے ہیں۔''

بیرو (Barrow) کا ماننا ہے کہ :

''کسی ترجمے کی معراج یہ ہے کہ اس میں اصل کی بازگشت ہو۔'' ۱؎

اور سائج (Syege) لکھتا ہے کہ :

''ترجمہ اس وقت تک ترجمہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ یہ اپنے الفاظ سے اصل شعر کا آہنگ نہ دے''

ایک کامیاب مترجم کے لیے ان کی پابندی لازمی قرار دی ہیں اور یہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ مترجم کے اندر کون کون سی صلاحیتیں ہونی چاہیے۔

1. جس زبان سے ترجمہ کیا جا رہا ہے اس زبان کی لغت سے، اصطلاحات اور محاروں سے، کسی قدر ادبیات سے اور تھوڑی بہت تاریخ سے واقفیت اور نکھرا ہوا ذوق ضروری ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جس زبان کی تصنیف کا ترجمہ کرنا ہے اس زبان پر مترجم کو ماہرانہ عبور حاصل ہو۔

''خشونت سنگھ نے اردو ہندی اور پنجابی کی کئی ادبی تخلیقات کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ ترجمے کے مسائل کا انھیں پورا احساس ہے ان کا کہنا ہے کہ جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے مترجم کو اس پر عبور حاصل ہو اور جس زبان سے ترجمہ کیا جا رہا ہے اس کی تھوڑی بہت واقفیت کافی ہے۔'' ۱؎

لیکن وہ دوسری ہی سانس میں اپنے تجربے بیان کرتے ہیں کہ علامہ اقبال کے 'شکوہ جواب شکوہ' کا انھوں نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ :

''درخیبر (حجاز) اور درۂ خیبر (پاکستان اور افغانستان کی سرحد پر) کا فرق انھیں آسانی سے معلوم نہیں ہو سکا۔ نیز بحر ظلمات اور بحر اوقیانوس Atlantic Ocean کے سمجھنے میں بھی انھیں دقت ہوئی۔''

''حفیظ جالندھری کی نظم 'ابھی تو میں جوان ہوں' کے انگریزی ترجمے میں انھوں نے ترنم ہزار کو A Thousand Melodies لکھا ہے۔ جب کہ اس جگہ 'ہزار' بلبل کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان اور بعض دوسرے ماہرین فن کا یہ خیال پوری طرح صحیح نہیں ہے کہ جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے اس پر عبور اور جس زبان سے ترجمہ کیا جا رہا ہے اس کی تھوڑی بہت واقفیت کافی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مترجم کو دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہونا چاہیے۔'' ۱؎

ایک ہی مترجم کا دو زبانوں پر بیک وقت عبور حاصل ہونا کافی مشکل شرط ہے اور ایسے مترجمین کی تعداد نہیں کے برابر ہوگی۔ اس لیے مترجم جس زبان سے ترجمہ کر رہا ہے اس زبان کے کتابی علم سے تھوڑی بہت یا جتنی زیادہ واقفیت ہو اچھا ہے تاکہ وہ اصل عبارت کے سیاق وسباق اور خیال کی نزاکتوں کو پورے طور سے سمجھ کر ترجمے میں منتقل کر سکے۔

2. جس زبان میں ترجمہ کرنا ہے اس پر ماہرانہ عبور حاصل ہو۔ اس کی تفصیل ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے یوں بیان کی ہے :

''......تصنیف کی زبان سے کہیں زیادہ قدرت اس زبان میں ہونی چاہیے جس میں ترجمہ کرنا مقصود ہے۔ یہاں تک کہ اس زبان میں خود لکھ لینے کی اچھی خاصی مشق اور اس زبان کا پہلو دار علم ہونا چاہیے۔ پہلو دار علم سے مراد یہ ہے کہ اس کے ماخذ کا جہاں جہاں سے وہ سیراب ہوئی ہے ان سرچشموں کا، اس کے نشیب وفراز کا علم ہو۔ الفاظ کہاں سے آئے، کیونکر آئے، ان کے لغوی معنی کیا تھے، اصطلاحی معنی کیا ہو گئے اور کیا کیا ہو سکتے ہیں۔ ان کے روزمرہ اور محاورے کیونکر بنے۔ انھیں مختلف موقعوں میں کیسے کیسے استعمال کیا گیا اور آئندہ کیسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ان میں مختلف اوقات میں کیا تبدیلیاں ہوئیں اور ان تبدیلیوں کی بنیاد پر اور کیا تبدیلیاں ممکن ہیں۔ ان کی مدد سے اور نئے سانچے کیسے بن سکتے ہیں۔ ایک ہی معنی کتنے مفہوم اپنے دامن میں رکھتا ہے اور ایک ہی لفظ کو جب مختلف نسبتوں سے ادا کیا جائے تو اس کے لیے کتنے مختلف وزن کے الفاظ موجود ہیں۔''

3. مترجم جس موضوع کا ترجمہ کر رہا ہے اس کی اس موضوع سے مناسب حد تک واقفیت ہونی چاہیے کیوں کہ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی اصطلاح، ایک ہی ترکیب یا ایک ہی لفظ ادب میں کچھ اور معنی رکھتا ہے۔ معاشیات ونفسیات میں دوسرے ہی معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ اس لیے مترجم کو چاہیے کہ وہ صرف اور صرف لغت پر توجہ نہ مرکوز کریں بلکہ خاص موضوع اور سیاق وسباق کی روشنی میں اصطلاحوں اور ترکیبوں کا ترجمہ کریں اور خاص موضوع کی کتاب یا مضمون سے گہری دلچسپی یا اس کے متعلق بنیادی

معلومات رکھتے ہوں تبھی اس موضوع کو ترجمہ کے لیے انتخاب کریں۔بہتر بھی یہی ہے کہ مختلف ترجمہ کرنے والے اپنی دلچسپی اور اپنی پسند کے مضامین منتخب کرلیں اوران ہی کا ترجمہ اپنے لیے مخصوص کرلیں کیوں کہ اس میں مترجم اور قاری دونوں کا فائدہ ہے اوراصل تصنیف بھی متاثر نہیں ہوتی۔

فن ترجمہ کے ماہرین کے درمیان بھی اختلاف کئی سطحوں پر پایا جاتا ہے کیوں کہ مختلف ماہرین فن نے جس طرح مترجم کے لیے مختلف شرطیں رکھی ہیں۔ان شرائط میں کافی اختلاف ہے۔یا کس کتاب کا ترجمہ کرنا چاہیے اور کس کا نہیں اور کس کتاب کو کیسے کرنا چاہیے۔یہ اوراسی طرح کئی باتیں ہیں جن پر ماہرین کا کوئی متفقہ فیصلہ نہیں ہے بلکہ متنازعہ فیہ مسائل ان کے درمیان ابھر کر سامنے آگئے ہیں۔ترجمہ کے اصول کیا ہیں اور ترجمہ کس طرح کرنا چاہیے یا ترجمہ کس طرح اور کیسا ہونا چاہیے اس پر ماہرین کی مختلف آرا ہیں۔اور یہ آرا ایک دوسرے سے کافی مماثل بھی ہیں اور مختلف ومتضاد بھی ہیں۔مثلاً ترجمہ کس طرح ہونا چاہیے یا ترجمہ کس طرح کرنا چاہیے اور قاری ترجمہ کو کس طرح لے یعنی ترجمہ کے بارے میں قاری کا کیا رویہ ہونا چاہیے۔تھیوڈر ساوری (Theodore Savory) نے The Art of Translation (London, 1959) میں بارہ نکات کا ذکر کیا تھا جن سے مترجم پر عائد ذمہ داریوں کا بخوبی علم ہوتا ہے۔وہ بارہ نکات درج ذیل ہیں :

1. ترجمہ میں اصل متن کے الفاظ کا ترجمہ ہونا چاہیے۔
2. ترجمہ اصل متن کے معانی ومفاہیم پر مشتمل ہونا چاہیے۔
3. ترجمہ کو اصل تصنیف کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔
4. ترجمہ کو ترجمہ ہی کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔
5. ترجمہ میں اصل تصنیف کے اسلوب کی جھلک ہونی چاہیے۔
6. ترجمہ کو مترجم کے منفرد اسلوب کا نمائندہ ہونا چاہیے۔
7. ترجمہ کو اصل متن کے زمانے تحریر کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔
8. ترجمہ کو مترجم کے زمانے تحریر کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔
9. ترجمہ میں اصل تصنیف سے حذف واضافہ کیا جاسکتا ہے۔
10. ترجمہ میں اصل متن سے حذف اوراضافہ کبھی ممکن نہیں۔
11. نظم کا ترجمہ نثر میں ہونا چاہیے۔
12. نظم کا ترجمہ نظم میں ہونا چاہیے۔

اگر ہم ان مندرجہ بالا نکات اورگذشتہ اوراق پر غور کریں تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ترجمہ چاہے سائنسی یا ادبی مواد کا ہو اور اسے لفظی،معنوی یا جمالیاتی قالب میں ڈھالنا ہو یا لغوی،صوتی،استعاراتی اجزا یا ابعاد کو ایک دوسرے میں مدغم کرنے کی کوشش ہو سب کے الگ الگ اصول اور ضابطے ہیں اور ان کو پرکھنے کے مختلف اصول اور پیمانے ہیں۔ ترجمہ کے ناقدین مترجمہ عبارت یا کتاب کو ان ہی اصول وضوابط پر پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ادبی معیار قائم کرتے ہوے مختلف فنون کے تراجم میں درپیش مختلف پریشانیوں کا ذکر کرتے ہیں۔اور ترجمہ کی اصل غایت یعنی زبان و بیان کی نئی جہتوں،تجربات کی نئی سمتوں اوراحساسات کے نئے رنگوں کو دیکھنے اور سمونے کی کوشش کرتے ہیں۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے ترجمہ کی اصل غایت بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

> ”ترجمے کا مقصد پایان کار دوزبانوں کے مابین تہذیبی فصل یعنی Barrier کو لمحاتی طور پر ختم کرنا اور مخصوص کلچروں کی مختلف الرکزیت یعنی Eccentricity کو فی الوقت محو کرنا اور باہمی لسانیاتی زرخیزی کو وجود میں لانا ہے۔ایسا کرنے میں اگر قطعیت کا حصول ممکن نہ بھی ہو تب بھی صحت کے قریب قریب پہنچنے کی کوشش یعنی Approximation بہرحال ضروری ہے۔کسی بھی زبان کے محاوروں کو مردہ استعاروں کا نام دیا گیا ہے اور استعارے چاہے وہ توانا اور متحرک ہوں یا منجمد مضمحل اور یخ بستہ،وہ پیدا وار ہوتے ہیں مخصوص تہذیبی ماحول اور آب و ہوا کے اور مترجم کا کام دراصل اس تجربے کی تشکیل نو اور ترسیل ہے جس نے کسی زبان کے مزاج اور رنگ روغن کو جنم دیا ہے“

حوالے

01 پروفیسر محمد حسن : نوعیت اور مقصد،مشمولہ قمر رئیس (مرتبہ) ترجمہ کا فن اور روایت،تاج پبلشنگ ہاؤس،1974

02 پروفیسر اسلوب احمد انصاری؛ترجمہ کا عمل مشمولہ نقد ونظر علی گڈھ 1987

03 ڈاکٹر ظ۔انصاری،ترجمے کے بنیادی مسائل،مشمولہ خلیق انجم (مرتبہ) فن ترجمہ نگاری،ثمر آفسیٹ پرنٹرز،نئی دہلی،1995

04 کلیم الدین احمد ”فرہنگ ادبی اصطلاحات“،ترقی اردو بیورو،نئی دہلی،1987

05 سید ضیاء اللہ ”اردو صحافت،ترجمہ وادارت“،کرناٹک اردو اکادمی،بنگلور،1994

06 وحید الدین سلیم : وضع اصطلاحات،ترقی اردو بیورو،نئی دہلی

07 بلال احمد زبیری ”سماجی علوم کا ترجمہ مسائل ومشکلات“ مشمولہ اعجاز راہی (مرتبہ) اردو زبان میں ترجمے کے مسائل،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،1986

08-George Steiner (1978) On Difficulty and Other Essays, Oxford University Press, London,

09-S. R. Faruqi "Language, Literature and Translation" in R.S. Gupta (ed) Literary Translation, Creative Books, New Delhi, 1999,

☆☆☆